۴۴ : اسلامی معاشیات کے متعدد ماہرین نے اس نکتے سے استدلال کیا ہے۔مثال کے طور پر دیکھئے:

Siddiqi, "*Issues in Islamic Banking*"; Chapra, "*Towards a Just Monetary System*," 117-122, Chishti, "Relative Stability of an Interest-Free Economy"; Khan, "Islamic Interest-Free Banking," 15-35 and 201-206; Mirakhor and Zaidi, "*Stabilization and Growth in an Open Economy*"; and Siddiqi and Fardmanesh, "Financial Stability and a Share Economy."

۴۵ :اس مسئلے کے بارے میں مزید معلومات کے لیے چھاپرا اور خان کی تصنیف "Late Settlement of Financial Obligations" مطبوعہ ۲۰۰۰ء کا سیکشن 3.1 دیکھئے۔

۴۶ : مطلوبہ اداراتی بنیادی ڈھانچے پر مزید معلومات کے لیے دیکھئے چھاپرا اور احمد کی تصنیف

Regulation and Supervision of Islamic Banks, 79-84

عالمی امن اور قیام عدل: اسلامی تناظر

انیس احمد

امن کا حصول اور قیامِ عدل کا تصور، دنیا کے بیشتر مذاہب میں کسی نہ کسی حوالہ سے ایک بنیادی مسئلہ اور ایک مشترکہ خواہش کی شکل میں موجود نظر آتا ہے۔ اگر مزید حقیقت پسندی سے تجزیہ کیا جائے تو سیکولر مفکرین کے نزدیک بھی امن اور عدل سوچ بچار کا ایک بنیادی موضوع ہے، اگرچہ ان کی اس فکر کے پیچھے کارفرما قوت محرکہ اور مذاہب عالم کے اساسی تصورات میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کو اپنی بقاء، قیام اور ترقی کو یقینی بنانے کے لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ جنگ کے مقابلہ میں ایک پُرامن فضا پائی جائے جو معاشی ترقی، انفرادی آزادی اور اخلاقی اضافت کے تصورات کو پروان چڑھانے میں مددگار ہو۔ اس کے برخلاف حالت جنگ کا پایا جانا سرمایہ دارانہ نظام کے اہداف کے حصول عموماً سے مناسبت نہیں رکھتا، چنانچہ جنگ کو عالمی امن اور عدل کے قیام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تصور کیا جاتا ہے۔

نوسرمایہ دارانہ فکر نے سامراجیت کے موثر حربوں، خصوصاً عسکری قوت کے استعمال سے نوآبادیاتی نظاموں کے قیام اور جنگوں کے ذریعہ قدرتی اور مادی وسائل پر قبضہ حاصل کرنے کی حکمت عملی کا نئے سرے سے جائزہ لینے کے بعد سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے اب جنگ کی جگہ امن کو بطور ایک وسیلہ کے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور خام مال کے حصول اور اپنی مصنوعات کے لیے نئی منڈیاں پیدا کرنے کے لیے عسکری قوت کی جگہ ''امن پسندی'' کے نعرے کے ذریعہ اپنے مقاصد کی تکمیل چاہی۔ نئی حکمت عملی پر مبنی سوچ یہ نظریہ سامنے لائی کہ امن اور امن پسندی بھی آزاد تجارت کی نقل و حرکت کے لیے راہ ہموار کر سکتے اور سرمایہ دار طاقتوں کو ان کے مقاصد کے حصول میں مدد دے سکتے

ہیں، جن کے لیے روایتی طور پر خوں ریز جنگیں لڑی جاتی رہی ہیں۔

عالمی جنگوں کے بعد کے دور میں، تجارت، سفر اور جمہوریت کی تثلیث کو بین الاقوامیت کی بنیاد سمجھا گیا۔ امن کی تلاش کے اس دور میں طبعی جنگوں کو تجارت اور سفر کا دشمن تصور کرتے ہوئے، ان سے بچنے کی کوششیں کی گئیں۔ سرد جنگ کے دور نے علاقائی معیشتوں، باہمی مفاہمت اور جوہری امتناع کے فروغ کے لیے نئے مواقع فراہم کیے۔ اقوام متحدہ کا قیام، نظری طور پر، عالمی و بین الاقوامی سطح پر امن اور صلح جوئی کے لیے ایک غیر متنازع ادارہ کا قیام تھا۔ اس بین الاقوامی ادارے کی کامیابی اور ناکامی کی بحث سے قطع نظر، اس کا اصل کردار تنازعات کے پر امن تصفیے میں سہولت فراہم کرنا باور کیا گیا تھا۔ چنانچہ امن قائم کرنا اور قائم رکھنا، کچھ عرصے تک، اس سیکولر ادارے اور اس کی رکن ریاستوں کے ایمان کا حصہ بنا رہا۔

اس مقام پر یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ مغربی سرمایہ داری کے نظام کو اپنی کامیابی اور فلاح اسی میں نظر آئی کہ جنگ عظیم کے تلخ تجربہ کے بعد ایک بظاہر نرم حکمت عملی اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اختیار کی جائے۔ اِس حکمت عملی میں امن کا قیام اور پر امن تحریکوں کے ذریعہ معاشرتی اور سیاسی مسائل کے حل کو اہمیت دی گئی۔ امن اور عدم تشدد پر مبنی مزاحمت کی تحریکوں نے، تاریخی سطح پر، یورپ کی سامراجی اور نو آبادیاتی طاقتوں کے استحصال اور جبر سے لوگوں کو آزاد کرانے کے لیے، نہ صرف جمہوری جدوجہد بلکہ صنفی مساوات جیسی تحریکوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کیا۔ چنانچہ مغرب میں آزادئ نسواں کی تحریک، جس نے عورتوں کے لیے عادلانہ اور منصفانہ کردار کا نہیں بلکہ مساوی حقوق کا مطالبہ کیا، کبھی پر تشدد نہیں ہوئی اور ہمیشہ پر امن رہی۔ گو سیاسی محاذ پر معاشرے کو جمہوری بنانے کی تحریکیں بعض اوقات پر امن رہیں تو دوسرے مواقع پر پر تشدد بھی ہو گئیں۔ اس کے باوجود قیام امن یا تنازعات کے تصفیے کی عالمی تحریکیں، فوجی طاقت کے استعمال کے بغیر، اپنی بنیادی سیکولر خصوصیات کے ساتھ، بہتر انسانی ماحول کے لیے کام کرتی رہیں۔ ہیلسنکی پراسس یا جوہری ہتھیاروں سے پاک دنیا کی تحریک، امن کے لیے اس سیکولر انداز فکر کی ایک مثال ہے۔

مغربی سامراج کی ''نرم حکمت عملی'' میں یہ امر بھی شامل رہا کہ جہاں کہیں ''مذہب'' سے گہری وابستگی پائی جائے، ان افراد اور اداروں کو انتہا پسند کہہ کر پکارا جائے چنانچہ گہری اور قابل مشاہدہ مذہبی وابستگی رکھنے والے اشخاص، اکثر انتہا پسندی، بنیاد پرستی، تشدد، دہشت گردی اور خوں ریزی کو رواج دینے کے ملزم ٹھہرائے جاتے رہے۔ اس حوالے سے نہ صرف مسلمانوں کی بعض تحریکات بلکہ عیسائی دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے بعض واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ تشدد اور انتہا پسندی دنیا کے کسی بھی خطے میں پروان چڑھ سکتی ہے، چنانچہ شمالی آئرلینڈ میں کیتھولک اور پروٹسٹ فرقے ایک دوسرے کو، عیسائیت کی بظاہر امن و محبت کی تعلیمات کے باوجود، مار دھاڑ اور تشدد کا نشانہ صدیوں تک بناتے رہے۔ ایسے ہی بوسنیا ہرزیگوینا میں ایک زبان بولنے اور ایک مقام پر پیدا ہونے والے مسلمانوں کو مذہبی نفرت و تشدد اور بربریت کا نشانہ بنایا گیا۔ دونوں صورتوں میں صورت حال کی سنگینی اور تشدد کے استعمال کی مکمل مذمت کرتے ہوئے ہمارے لیے یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ بوسنیا میں مذہبی اور نسلی بنیاد پر مسلمانوں کا بہیمانہ قتل عام عیسائیت کی تعلیمات کی بنا پر کیا گیا۔ گویا بعض متشدد عیسائیوں کے ایک فعل کو اپنی تمام تر اخلاقی برائی اور درندگی کے باوجود عیسائیت سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے پاس اس بات کے شواہد بھی موجود ہیں کہ باضمیر، دیانت دار اور اخلاقی اصولوں پر کاربند رہنے والے بعض یہودی فلسطین میں مقامی مسلمانوں اور عیسائیوں کے خلاف صہیونیوں کی جانب سے روا رکھے جانے والے وحشیانہ تشدد کی کبھی حمایت نہیں کرتے۔ متعدد اسرائیلی پائلٹوں کا فلسطینی آبادیوں کو نشانہ بنانے سے انکار ظاہر کرتا ہے کہ تمام یہودی فلسطین میں صہیونی دہشت گردی کے موید نہیں ہیں۔ یہ مختصر جائزہ نشان دہی کرتا ہے کہ عالمی امن کا قیام سیکولر اور مذہبی اشخاص میں یک جا اہمیت کا حامل ہے، اور مذہب کے نام پر تشدد کرنے کو جائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

امن کا عمل اور امن کے لیے اقدامات، بالعموم تنازعات کے پرامن تصفیے، اجتماعی سلامتی کی فکر، تخفیف اسلحہ، پیشگی احتیاطی سفارت کاری اور عملیت پسندی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ جھگڑے اور نااتفاقیاں، خواہ سیاسی و معاشی ہوں یا نظریاتی، عام طور پر یا تو طاقت واختیار سے طے پاتے ہیں یا پھر

مذاکرات سے، یعنی ذہنی صلاحیت، ثالثی، روبرو معاملت اور مکالمے سے۔ چنانچہ امن کے لیے کیے جانے والے اقدامات اس مقصد کی خاطر افہام و تفہیم کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔

اجتماعی سلامتی کی فکر عموماً دوطرفہ یا کثیر الاطراف تعلقات کی جانب لے جاتی ہے اور پھر یہ سلسلہ علاقائی اور عالمی امن تک پہنچتا ہے۔ جبکہ تخفیف اسلحہ کے لوازم میں ہتھیاروں کے عدم توازن کا محاسبہ، جوہری ہتھیاروں کی تحدید، جوہری فضلے کو باقاعدہ طریقے سے ٹھکانے لگانا اور ہتھیاروں کی دوڑ سے رضاکارانہ گریز کی کوششیں، خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں۔ یہ عمل عالمی امن کے بہتر مستقبل کے لیے زمین تیار کرتا ہے۔ اقوام متحدہ جیسے اداروں کی براہ راست شرکت کے ذریعے حفظ ماتقدم کی سفارت کاری بھی قیامِ امن کے لیے ایک قابل عمل طریقہ ہے۔ اگرچہ امریکی استعماریت کی یک طرفہ کارروائیوں، خصوصاً عراق پر اس کے حملے اور غیر قانونی قبضے نے، اس تصور کو شدید نقصان پہنچایا، بلکہ اقوام متحدہ کے ادارہ کے اس کردار کی موت کا اعلان کر دیا ہے تاہم اقوام متحدہ جیسے باوقار ادارے کی اس ناکامی کو ہمارے لیے مایوسی کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ اس چیز کو، دوسری جانب، ہمارے اس نظریے کی تقویت کا باعث بننا چاہیے کہ پرانی حکمت عملی کے ناقص یا ناکام ہونے پر کف افسوس ملنے کی جگہ ہمیں ایک ایسی ہمہ گیر حکمت عملی (phenominological) اختیار کرنی چاہیے جس میں دانش ور، مذہبی رہنما، پالیسی سازی میں شریک افرادِ معاشی، سماجی، سیاسی اور بین الاقوامی امور کے ماہرین کا یک جا ہونا اور بات چیت کے عمل میں حصہ لینا، باہمی اعتماد سازی، اور عدم تشدد پر مبنی عالمی سوچ کے روشن امکانات اور ایک بہتر ماحول تخلیق کر سکتی ہے۔

امن کی اس موجودہ صورت حال پر عصری عالمی مذاہب کا موقف کیا ہے؟ خاص طور پر یہ کہ اسلام امن کے معاملے کو کس طرح دیکھتا ہے؟ یہ جاننے کے لیے ہمیں قرآن وسنت میں، امن کے معنی اور متعلقات کی معروضی تحقیق کا سہارا لینا ہوگا۔

اسلام کی اصطلاح عربی کے مادّے س ل م سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی سلامتی اور اللہ کی بندگی کو قبول کر لینے یا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو سب سے بالاتر مانتے ہوئے اس کے اختیار کے سامنے

سر جھکا دینے کے ہیں۔اسلام کے اس لغوی مفہوم اور قرآن کریم میں اللہ کی سلامتی میں آجانے اور آخرت میں بھی دارالسلام کی تمنا کرنے کی تعلیم کے ساتھ ''مقدس جنگ'' یا ''اسلامی جہاد'' کی حیثیت کیا ہے۔کیا واقعی قرآن وسنت چاہتے ہیں کہ جہاں کہیں کوئی مشرک نظر آجائے اسے تہہ تیغ کر دیا جائے؟ کیا جہاد کا مقصد تلوار کے زور سے اسلام نافذ کرنا ہے؟ کیا اسلام بجائے خود تشدد اور انتہا پسندی کا علمبردار ہے؟اور اگر ایسا نہیں ہے تو کیا وجہ ہے کہ عالمی ابلاغ عامہ کے ذرائع میں مسلمان اور اسلام کی تصویر ایک انتہا پسند دین کی پیش کی جاتی ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام کی صحیح تصویر تو قرآن وسنت کے آئینے میں نظر آسکتی ہے لیکن مغرب سے آنے والی بے شمار صحافیانہ تحریرات اور برقی ذرائع ابلاغ،،انٹرنیٹ، یوٹیوب، فیس بک اور ٹی وی نٹ ورک بڑی حد تک اس تاریک تصویر کی تخلیق کے ذمہ دار ہیں۔ایک مثال جوڈتھ ملر Judith Miller کی کتاب "God has Ninety Nine Names: Reporting from a Millitant Middle East" ہے۔مشرق وسطیٰ میں کچھ زیادہ عرصہ رہے بغیر اور عربی زبان سے واجبی واقفیت بھی نہ رکھنے کے باوجود، وہ نیو یارک ٹائمز کی نامہ نگار کی حیثیت سے،اسلام کے بارے میں اپنی معلومات کے مستند ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔

ایڈورڈ سعید اس کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ''جو چیز ملر، سیموئیل ہن ٹنگٹن، مارٹن کریمر، برنارڈ لیوس، ڈینیل پائپس، سٹیون ایمرسن اور بیری روبن جیسے 'ماہرین' اور اسرائیلی دانشوروں کی ایک پوری نسل کے نزدیک اہمیت رکھتی ہے وہ اس بات کو یقینی دکھانا ہے کہ [اسلام کا] 'خطرہ' ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑا ہے، لہٰذا اسلام کو دہشت گردی اور تشدد کے حوالے سے بدنام کرنا اور یوں اپنے لیے منافع بخش مشاورتی مناصب، ٹی وی پر بکثرت آمد اور کتابوں کے معاہدوں کی ضمانت حاصل کرنا ایک نفع بخش سودا ہے۔ایسی ہی کوشش اسٹیفن شوارٹز کی تصنیف The Two Faces of Islam: The House of Saud from Tradition to Terror میں بھی کی گئی ہے۔یہ اژدھوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے سورماؤں کی تلاش [کی طرح] ہے، جن کا وجود مصنف کی

خیالی دنیا کے سوا کہیں نہیں ا۔

اسلام کو اس طور پر پیش کیے جانے کی ایک وجہ، شاید، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، جہاد کے بارے میں یہ تاثر قائم کرنا ہے کہ یہ غیر مسلموں اور ان کی تہذیبوں کو نیست و نابود اور تباہ و برباد کرنے کا حربہ ہے۔ نائن الیون کے المناک واقعے نے، اسلام کے بارے میں اس صدیوں پرانی بدگمانی کو غیر معمولی تقویت دے دی ہے کہ یہ ایک پرتشدد ''مذہب'' ہے۔ اس کے جواب میں مسلمانوں کی جانب سے عام طور پر جو رویہ اختیار کیا گیا وہ معذرت خواہی یا ردعمل پر مبنی ہے، یہ دونوں رویے نہ تو جہاد کے حقیقی معنی اور مقصد کی تفہیم میں مددگار بنے، نہ ان الزامات کے ازالے میں مفید ثابت ہو سکے۔ اس طرح جہاد کی تعریف، مقصد اور طریقے کو درست طور پر نہ سمجھنا، اسلام کو بآسانی تشدد کے مترادف باور کرانے میں کامیاب ہو سکا۔

تشدد کی تعریف عام طور پر اذیت دینے، توہین کرنے، خوف زدہ کرنے یا مجروح کرنے کی خاطر قصداً طاقت کا استعمال بیان کی جاتی ہے۔ چنانچہ جب کسی کو قتل کرنے یا نقصان پہنچانے کے لیے کسی اسلحہ یا ریموٹ کنٹرول آلہ کا استعمال کیا جاتا ہے تو اسے تشدد یا دہشت گردی کا عمل کہا جاتا ہے۔ تاہم ایسی جسمانی چوٹوں کو، جن کے پیچھے کسی کو دکھ دینے یا نقصان پہنچانے کی نیت نہ ہو، ہم تشدد کا استعمال نہیں کہتے چاہے عملاً ایسے کسی کام سے کسی کے جسم کا کوئی حصہ ضائع یا زخمی ہو جائے۔ جب تک کسی ایسے کام کا مقصد کسی شخص کی حالت کو بہتر بنانا، اس کی اصلاح کرنا اور زندگی کو اس کے لیے خوشگوار بنانا ہو، جیسے آلات جراحی کے ذریعے ایک دندان ساز کسی کا دانت اکھاڑتا ہے یا کوئی سرجن کسی مریض کی جان بچانے کے لیے چاقو استعمال کرتا ہے۔ تو ہم مریض کے جسم سے خون نکلنے اور دانت سے محروم ہو جانے کے باوجود اِس عمل کو تشدد نہیں کہتے۔

اس سیاق وسباق میں یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ قرآن کریم میں جہاد کو معاشرے میں امن و انصاف کے قیام کے لیے ایک اصلاحی حکمت عملی اور لاقانونیت، ظلم اور استحصال کے محاسبے اور ازالے کے ایک طریقے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

جولوگ معذرت خواہانہ دلائل کی راہ اپناتے ہیں وہ اکثر جہاد کو دو اقسام میں بانٹتے ہیں، یعنی دفاعی جہاد جو ان کے خیال میں اسلام کا اصل مدعا اور مقصود ہے اور دوسری قسم میں جسے جارحانہ جہاد کہا جاتا ہے، اس کی گنجائش ان کے خیال میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے اِس تصور میں اس انتہا تک چلے جاتے ہیں کہ بنیادی طور پر دفاعی ہونے کی وجہ سے جہاد کا نظریہ کسی کے خلاف جنگ میں پہل کی اجازت نہیں دیتا۔ دوسری طرف بعض مسلمان جہاد کا مطلب ہر اس چیز کے خلاف مکمل جنگ قرار دیتے ہیں جو ان کے خیال میں غیر اسلامی ہو۔ ان دونوں تعبیروں میں حقیقت کا کچھ عنصر تو ہوسکتا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی تصور جہاد کے مفہوم کا پوری طرح احاطہ نہیں کرتا۔

اگر ہم براہ راست قرآن کو دیکھیں، جو اسلامی تعلیمات کا حتمی اور اولین مآخذ ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ قرآن میں جہاد کا لفظ تقریباً چالیس (۴۰) مقامات پر استعمال کیا گیا ہے، جبکہ قتال کی اصطلاح کم و بیش ایک سو سڑسٹھ (۱۶۷) مقامات پر ایک یا دوسرے سیاق وسباق میں استعمال کی گئی ہے۔ جہاد جہاں اپنے قرآنی مفہوم میں کسی مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد، بھرپور کوشش، اور مستقل دوڑ دھوپ کا نام ہے، وہیں قتال کے معنی، عام طور پر لڑائی یا جنگ کے ہیں۔

جہاد کا مقصد اور نیت، قرآن کی رو سے، لوگوں کو ظلم و جبر، بے انصافی، استحصال، غلامی، اور کسی قوم کو اس کے انسانی حقوق پر عائد کی گئی بندش سے نجات دلانا اور مظلوم انسانوں کے بنیادی حقوق کی بحالی ہے۔ اگرچہ کئی مقامات پر اس اصطلاح کا اطلاق صرف مسلمانوں پر ہی ہوتا ہے، لیکن اسے محض مسلمانوں کے انسانی حقوق کی بحالی تک محدود کرنا بھی درست نہیں ہوگا، اس کی وجہ واضح طور پر یہ ہے کہ قرآن جب مستضعفین کی اصطلاح استعمال کرتا ہے، جس کا مطلب بدسلوکی اور ظلم کا نشانہ بنائے جانے والے لوگ ہیں تو وہ اسے مسلمانوں تک محدود نہیں کرتا بلکہ جس کسی کو بھی بندگی رب کرنے کی وجہ سے پریشان اور انسانی حقوق سے محروم کیا جائے وہ مستضعفین کی تعریف میں شمار کیا جائے گا۔ چنانچہ وہ ایسے مظلومین کو ظلم و جبر سے نجات دلانے کے لیے مسلمانوں کو ان کی آزادی کے لیے لڑنے اور امداد کرنے پر ابھارتا ہے۔ ''آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں

کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں، اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی مددگار پیدا کر دے"[۲]۔

دوسری جگہ قرآن خصوصیت کے ساتھ کم از کم تین مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں بتاتا ہے کہ ان کی عبادت گاہوں کا تحفظ کیا جائے، تاکہ ان "مذاہب" کے ماننے والے اپنے عبادت خانوں میں اپنے رب کا ذکر کر سکیں اور ایسا کرنے کو مسلمانوں کی ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ اسلام کا اصولی موقف یہ ہے کہ ان کے ثقافتی، مذہبی اور انسانی حقوق کو برقرار رکھنے کی خاطر ان عبادت خانوں کو کسی تشدد کا نشانہ نہ بننے دیا جائے: "اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں۔ اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے"[۳]۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد، قرآن کی روشنی میں، انسانی حقوق، آزادی اور وقارِ آدمیت کے تحفظ کی تحریک کا نام ہے۔ یہ 'کافروں' کے خلاف 'ہولی وار' کا حکم نہیں دیتا۔ 'ہولی وار' کی اصطلاح، جس کا مطلب عربی میں 'الحرب المقدس' ہوگا، قرآن اور سنت کے ذخیرۂ الفاظ میں عملاً کہیں موجود نہیں، نہ قرآن کریم نے اور نہ کسی حدیث میں جہاد کے لیے الحرب المقدس کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اسی طرح peace (امن، سلامتی، صلح) اسلامی روایت میں war کی مخالف اصطلاحات کے طور پر استعمال ہوتی ہیں، چنانچہ اسلام کا مدعا یہ نظر آتا ہے کہ وہ امن، برداشت، باہمی مفاہمت، اور مستقل طور پر جاری منظم ثقافتی وتہذیبی مکالمے کا احیاء چاہتا ہے۔ پوری انسانیت کو امت واحدہ کی حیثیت سے مخاطب کرتے ہوئے قرآن تمام انسانوں کو امن کی روش کو پروان چڑھانے کی دعوت دیتا ہے: "اللہ تمہیں دارالسلام کی طرف دعوت دے رہا ہے، جس کو وہ چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے"[۴]۔ امن کی اصطلاح اپنی مختلف شکلوں میں قرآن کے اندر تقریباً ایک سو اڑتیس (۱۳۸) مقامات پر استعمال ہوئی ہے۔

امن کا کلچر، اسلامی نقطۂ نظر سے تخفیف اسلحہ، اجتماعی سلامتی یا امن بحیثیت فنکشنل ازم تک محدود نہیں ہے۔ امن کے بارے میں اسلام کا زاویہ نگاہ وسیع اور جامع ہے، یہ محض جنگ نہ ہونے کی کیفیت کا نام نہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ امن کے اسلامی مفہوم کو، جو عالمی نظام امن کے لیے عملی بنیاد فراہم کرتا ہے، تفصیلات میں جائے بغیر مختصراً سات نکات میں سمیٹا جاسکتا ہے۔ جن کا نقطہ آغاز توحید ہے۔

توحید: یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ امن اور انصاف، قرآن میں بار بار دہرائے جانے والے موضوعات کی حیثیت سے، اسلامی نظام فکر میں مرکزی مقام کے حامل ہیں۔ ان کا اظہار انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں امن وسلامتی کے تصورات دین کی سب سے اہم بنیاد توحید سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ توحید کے اس مرکزی مقام کی اہمیت کے کماحقہ واقف نہ ہونے کی بنا پر بعض اوقات توحید کو صرف ایک کلامی مسئلہ سمجھ لیا جاتا ہے جبکہ اسلامی فکر ونظر میں توحید کو کلیدی مقام حاصل ہے۔ عقیدۂ توحید ایک جانب ہر شخص سے اس کے عمل، رویے، انداز فکر اور معاشرتی معاملات سے، تنازع اور تضاد کو دور کرنے کے لیے شعوری کوشش کا مطالبہ کرتا ہے۔ توحید کا اثباتی پہلو خود توحید کی اصطلاح میں موجود ہے یعنی صرف اور صرف ایک خالق، رب، مالک، حاکم اور رحم کرنے والی ہستی کا اقرار، تسلیم ورضا کے ساتھ بندہ بن جانا اور اپنے تمام معاملات وتعلقات کو اللہ کی رضا کا تابع بنا دینا۔

اس طرح انفرادی سطح پر جو ارتباط، ہم آہنگی اور یکسانیت حاصل ہوتی ہے، وہ امن کے لیے ایک بڑا مؤثر اور معتبر ذریعہ بن جاتی ہے۔ توحید کا عقیدہ جب ایک بار دل ودماغ میں راسخ ہوجاتا ہے، تو وہ انسان کو اپنے گھر والوں یا کاروباری شرکاء سے معاملات میں نیز سرکاری ذمہ داریوں کی ادائیگی کے دوران، دہرے معیارات کے استعمال سے روکتا ہے چنانچہ داخلی تضادات کا منظم ازالہ اور فکر وعمل میں ہم آہنگی اور مطابقت کی نشو ونما، حقیقی امن کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ انسان کی زندگی کے بامقصد اور اخلاقی ضابطہ پر عمل پیرا ہونے کے لیے توحید سب سے زیادہ اہم قوت محرکہ ہے، لیکن اگر تحقیقی نگاہ سے دیکھا جائے تو نہ صرف انسانی زندگی میں بلکہ کائنات میں موجود ہر غیر روح یا ذی روح وحدانیت اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا مکمل طور پر تابع نظر آتا ہے۔ توحید کا آفاقی پہلو یعنی زندگی میں صرف ایک

اعلیٰ ترین اقتدار کی پیروی پر اگر دیگر مذاہب کے تناظر میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک غیر مسلم کے لیے بھی زندگی میں کامیابی کا راز توحید ہی میں مضمر ہے یعنی دو عملی اور دھرے اخلاقی نظام کی جگہ صرف ایک اعلیٰ اصول کی پیروی کرنا، توحید کا یوں آفاقی سطح پر اور انسانی زندگی میں کارفرما ہونا، اسے ان لوگوں کے لیے بھی متعلقہ اور قابل قبول بنا دیتا ہے جو مسلمان ہونے کا اقرار نہیں کرتے۔ اس طرح توحید کا اصول خیال اور عمل میں مطابقت، انفرادی اور سماجی سطحوں پر تنازعات کے حل کے لیے، ایک عالمی قابل عمل حل پیش کرتا ہے۔

عدل وتوازن: یہ گفتگو ہمیں دوسرے مرکزی اسلامی اصول، عدل اور انصاف کی طرف لے جاتی ہے، جو معاشرے میں امن کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ یوں تو عدل کا اصول قرآن کریم میں مختلف حوالوں سے آتا ہے لیکن قرآن کریم میں عدل کے کم از کم سات اہم پہلو وضاحت کے مستحق ہیں۔ سب سے پہلا اور سب سے اہم پہلو، قانون کی حکمرانی، قانونی مساوات اور انسانی جان کی قدر ہے۔ قانون کی حکمرانی کا نفاذ معاشرے کے مختلف حصوں پر یکساں طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسلامی قانون بنیادی حقوق کے معاملے میں مسلمان اور غیر مسلم میں فرق نہیں کرتا۔ غیر مسلم شہری کی جان، عزت، جائیداد اور سلامتی بھی اتنی ہی قیمتی ہے جتنی ایک مسلمان شہری کی۔ زندگی کی حفاظت اور بہتری، اولین قدر و قیمت کی حامل ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ معاشرے میں امن اسی صورت میں ممکن ہے جب انسانی زندگی کے تحفظ کو سب سے زیادہ فوقیت دی جائے۔ انسانی زندگی کی بہتری اور حفاظت، امن وسلامتی اور پائیدار معاشرے کے لیے ٹھوس بنیاد فراہم کرتی ہے۔ قرآن محض انسانی جانوں کے قتل کی مذمت نہیں کرتا بلکہ اعلان کرتا ہے کہ ایک انسانی جان کا ناحق قتل پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے، اور ایک انسان کی جان بچانا پوری انسانیت کو زندگی بخشنے کے برابر ہے [۵]۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح احکام ہیں جن کی رو سے پودوں، پرندوں اور جانوروں وغیرہ تک کو ناحق نقصان پہنچانے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں آپؐ یہ فرماتے ہیں کہ یوم الحساب میں آپؐ اس پرندے کی طرف سے وکالت فرمائیںگے جسے بے گناہ محض تفریح کے طور پر نشانہ بنایا گیا اور دیگر

احادیث جان کی حرمت کے بارے میں آپؐ کی فکر کی نشان دہی کرتی ہیں۔

سماجی اور معاشی عدل: اسلام کے تصور عدل کا ایک امتیاز اس کا سماجی اور معاشی عدل قائم کرنا ہے۔ معاشرتی سطح پر قرآن کریم مغرب اور مشرق کے تصور انفرادیت پسندی (Individualism) کو تسلیم نہیں کرتا، چنانچہ ایک جانب وہ اصولی طور پر انسان کو اجتماعیت پسند اور معاشرہ میں اخلاقی طور پر ایک ذمہ دار مخلوق قرار دیتا ہے اور دوسری جانب معاشرتی اور سماجی فلاح اور عدل کے قیام کے لیے خاندان اور معاشرہ کا ایک نقشۂ عمل تجویز کرتا ہے جو نہ صرف خونی رشتہ داروں بلکہ معاشرہ کے مفلوک الحال افراد کی جان، مال اور عزت اور شہرت کی پوری حفاظت کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کے ساتھ انسانوں کے حقوق کی ادائیگی کو ایمان کی شرط قرار دیتا ہے۔ اس دنیا میں حقوق العباد کی صحیح طور پر ادائیگی ہی کی بنیاد پر دوسری اور ابدی زندگی میں انسان کو امن کے گھر (دارالسلام) کی خوش خبری سناتا ہے۔

قرآن و سنت اس حوالہ سے اہل ایمان کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ اپنے معاشرتی سیاسی اور معاشی معاملات میں اخلاقی رویہ اختیار کریں چنانچہ مالی بدعنوانی، سیاسی حقوق کی پامالی اور معاشرہ میں عدم تحفظ پر سخت سرزنش کرتے ہوئے معاشرتی، معاشی اور سیاسی فلاح کے لیے ایسا نظام قانون تجویز کرتا ہے جس میں مسلمان اور غیر مسلم ہر فرد تجارتی معاملات میں دیانت، سیاسی میدان میں حاکمیتِ الٰہی اور معاشرتی معاملات میں امن، اخوت، محبت اور عفو و درگزر کے ذریعہ پرسکون زندگی گزار سکے۔ ''اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، لین دین ہونا چاہیے آپس کی رضامندی سے''[٦]۔ ناپ تول کے پیمانوں کی درستگی اور معیار بندی کے حوالے سے قرآن اعلان کرتا ہے: ''پیمانے سے بھر کر دو تو پورا بھر کر دو، اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو، یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے''[٧]۔

قرآن جہاں جائز و منصفانہ اور شفاف معاشی لین دین کی تلقین کرتا ہے وہیں تمام تر ممکنہ طاقت کے ساتھ ربا اور سود کی شکل میں معاشی استحصال کی ممانعت بھی کرتا ہے کیونکہ سود اسلام کی نگاہ میں

معاشرے کے اندر استحصال اور تفریق کا بنیادی سبب اور معاشی ظلم و بے انصافی کا سب سے بڑا حربہ ہے چنانچہ قرآن کریم سودی کاروبار کرنے والوں کے خلاف اللہ اور رسولؐ کی طرف سے اعلان جنگ کرتا ہے۔

سیاسی آزادی و حریت: قرآن کے تصور عدل پر غور کیا جائے تو یوں نظر آتا ہے کہ عالمی امن کے قیام کے لیے سیاسی آزادی اور حریت لازم و ملزوم ہیں۔قرآن کریم تمام انسانوں کو صلاحیت اور اخلاقی برتری کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی حیثیت سے یکساں قرار دیتا ہے۔ وہ جماعت سازی اور معاملات کے فیصلہ کرنے میں مشاورت کو لازم قرار دیتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد معاملاتِ حیات کے فیصلوں میں شرکت کر سکیں۔اسلام نہ موروثی حکومت کو جائز سمجھتا ہے اور نہ ایسے سیاسی نظام کو تسلیم کرتا ہے جو جابرانہ قوانین اور قوت کے استعمال سے اللہ کے بندوں پر قابض ہو جائے۔

اسلام صرف شورائیت پر مبنی انتخابی سیاست یعنی خلافت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے قیام کی جدوجہد کو اہل ایمان پر فرض قرار دیتا ہے۔

معقولیت پر مبنی رویہ: عالمی امن کے قیام کے تناظر میں قرآن کریم انسانی رویہ اور طرز عمل میں عقل و ہوش کو بنیادی اہمیت دیتا ہے اور ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں فیصلوں کی بنیاد جذباتیت پر نہ ہو۔اسلام دل و دماغ میں اُس روایتی تفریق کو پسند نہیں کرتا جس میں دل جذبات کا مرکز ہو اور دماغ عقلی فیصلے کا۔ چنانچہ قلب و دماغ دونوں کو مبنی برحق طرز عمل کی تربیت دیتا ہے جو لوگ منفی جذبات کی بنیاد پر فیصلے کرتے ہیں ان کے بارے میں ارشاد کیا گیا لھم قلوب لا یفقھون بھا یعنی ان کے (سینوں میں) قلب ہیں لیکن وہ ان سے غور و فکر نہیں کرتے۔ ماہرین نفسیات و عمرانیات جس چیز کو emotional intelegence کہتے ہیں اسلام اس کو اخلاق و فکر پر مبنی فیصلہ سے تعبیر کرتا ہے۔

عالمی امن کے قیام کے لیے چوتھی بنیادی شرط معقول رویہ اور شخصی اور معاشرتی معاملات میں تدبر، غور و فکر کے بعد حکمت عملی کا وضع کرنا ضروری سمجھتا ہے، چنانچہ انفرادی طرز عمل ہو یا سیاسی، معاشی

اور بین الاقوامی حکمت عملی ہر شعبہ میں عقلی رویہ اور نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے ایسی حکمت عملی کا وضع کرنا ہی وہ طرز عمل ہے جو عالمی امن اور عدل کے قیام کی راہ ہموار کر سکے۔

حرمت نسل: عالمی امن کے قیام کے لیے پانچویں ناگزیر عالمگیر قدر انسانی رشتوں کا احترام، نسل کا تحفظ اور ایسے انسانی معاشرہ کا قیام ہے جس میں انسانی وجود گم نام نہ ہو بلکہ ہر فرد اپنے خاندانی تشخص کا حامل ہو۔ جن معاشروں میں پیدا ہونے والے بچے گم نام ہوتے ہیں اور اپنے شجرہ سے آگاہ نہیں ہوتے وہ قومیں عدم تشخص اور اپنی پہچان نہ ہونے کے سبب کم عمر جرائم، تشدد اور اخلاق باختگی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

اگر خاندان کا نظام منہدم ہو جائے اور نئی نسلوں کو اپنے شجرہ کا علم ہو اور نہ ہی اپنی خاندان کی محبت اور توجہ ملے تو وہ عدم توازن اور دھشت گردی کی طرف مائل ہوتے ہیں چنانچہ امریکہ اور دیگر ممالک میں Teen age جرائم کا بڑا سبب جینیٹک گمنامی قرار دی جاتی ہے۔ تحفظ نسل کا یہ اخلاقی اصول معاشرتی امن اور عالمی طور پر امن کا ماحول پیدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے اور مسلمان معاشرہ اور ریاست پر ذمہ داری عاید کرتا ہے کہ خاندان کے قیام کے لیے ایسے افراد جو مجرد ہوں ان کی شادیوں کا بندوبست کرے[۸]۔

اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ بیواؤں کے عقد ثانی کا بھی اہتمام کیا جائے اور انسانی gene کی حرمت و تقدس کو کسی شکل میں پامال نہ ہونے دیا جائے چنانچہ اس طرح جو انسانی معاشرہ وجود میں آتا ہے اس میں افراد کی شخصی زندگی ہو یا معاشرتی اور معاشی معاملات وہ ہر شعبہ میں توازن کو اختیار کرتے ہیں۔ اس طرح جو معاشرتی امن وجود میں آتا ہے وہ بین الاقوامی امن کے قیام کا پیش خیمہ بنتا ہے۔

رواداری اور مذہبی کثرتیت: عالمی امن کے قیام کو ممکن بنانے کے لیے قرآن و سنت مذہبی آزادی اور کثرتیت کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں چنانچہ ایک مثالی اسلامی ریاست میں ایک سے زائد مذہبی

اور ثقافتی روایتوں کا وجود نہ صرف ممکن ہے بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ مدینہ منورہ میں اہل ایمان کے ساتھ یہود کا وجود اور نجران میں بسنے والے عیسائیوں کو یکساں انسانی حقوق کی فراہمی یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہریوں کو اپنے مذہب و ثقافت پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ قرآن کریم نے جو اصول پیش کیا ہے وہ واضح طور پر دین میں اِکراہ یا زبردستی کا نہ ہونا ہے۔ کسی اور مقام پر یوں کہا گیا کہ ''تمہارے لیے تمہارا مذہب اور ہمارے لیے ہمارا دین'' گویا اسلامی معاشرہ میں دیگر مذاہب اور ثقافتی روایت کے وجود کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے اور یہ خیال بے بنیاد ہے کہ اسلامی ریاست ایک تھیا کریسی یا مذہبی اجارہ داری پر مبنی ریاست ہے۔ اسلام ایک ایسا رواداری پر مبنی معاشرہ اور ریاست قائم کرنا چاہتا ہے جس میں نہ تو بنیاد پرستی ہو اور نہ ہی مذہب کی بنیاد پر تفریق، جس کی مثال ہمیں آج کے نام نہاد ترقی یافتہ معاشرے میں بھی نظر نہیں آتی، چنانچہ فرانس اور جرمنی میں اسکارف کے استعمال پر پابندی اس دوعملی کی مثال ہے جس میں بظاہر سیکولر معاشرہ ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی غیر فرانسیسی یا جرمن ثقافت و مذہب کو آزادی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اسلام اس دوعملی کی شدت سے مذمت کرتا ہے اور اسلامی معاشرہ اور ریاست میں رواداری اور مذہبی و ثقافتی آزادی کے قیام کے ذریعہ بین الاقوامی سطح پر امن کے امکانات کو زیادہ روشن بنا دیتا ہے۹۔

عدل وانصاف کی بالادستی: عدل کا ایک اور اہم پہلو قانون کی حکمرانی کا قیام ہے یعنی معاشرہ کے کمزور اور طاقتور طبقات میں سے ہر ایک کے لیے یکساں منصفانہ نظامِ قانون اور اس کے قیام کے لیے ایک صالح قیادت کو ذمہ داری سونپنا جو صلاحیت، ایمان اور امانت کے سخت ترین معیار پر پوری اترتی ہو۔ چنانچہ فرمایا گیا ''مسلمانو اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو''۔ (النساء۴:۵۸) یہاں امانتوں کا واضح مفہوم ان ذمہ داریوں کا ہے جو معاشی، سیاسی، معاشرتی اور قانونی شعبوں میں افراد یا کسی جماعت کو سونپی جائیں۔ اسلام کی نگاہ میں نقصِ امن اور معاشرہ میں ظلم و ناانصافی کے پیدا ہونے کا بنیادی سبب مناصب اور ذمہ داریاں ایسے افراد کے حوالہ کر دینا ہے جو نہ صادق ہوں نہ امین بلکہ امانت میں خیانت کو اپنا

اولین پیدائشی حق سمجھتے ہوں۔ اس زاویہ سے دیکھا جائے تو اکثر مسلم ممالک کی سیاسی، معاشی اور ثقافتی قیادت ایسے افراد کے ہاتھ میں ہے جن کے اقتدار میں آنے کی بنیاد اہلیت اور امانت داری کی جگہ خونی رشتہ اور وراثت میں اقتدار حاصل کر لینا نظر آتا ہے، نتیجہ ظاہر ہے جب قیادت نا اہل ہو عدل کے منافی ظلم و استحصال کی مرتکب ہو تو معاشروں میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے عدل و توازن کا قیام امن کے وجود میں آنے کے لیے ایک بنیادی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

انسان کی تخلیق اور اس کی شخصیت کو توازن اور حُسن بخشنے کے حوالہ سے قرآن کریم ہمیں بطور یاددہانی متوجہ کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ''احسن تقویم'' یعنی بہترین ساخت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس تخلیقی عمل میں نہ صرف اس کے خمیر اور فطرت میں تعدیل رکھی ہے بلکہ اسے نِک سُک سے بھی درست کر کے اس کے ہر عضو کو بہترین خوبصورتی کے ساتھ بنایا ہے۔ گویا قرآن کریم میں عدل کا ایک مفہوم ساخت اور قوت کارکردگی کے لحاظ سے ہر مخلوق اور خصوصاً انسان کا تناسب، توازن اور جمالیات کے لحاظ سے بہترین شکل میں پیدا کیا جانا بھی ہے۔

عالمی امن اور عدل کے قریبی تعلق کا ایک اور پہلو اور عدل کے مفہوم کی ایک اہم شکل نسل، مذہب، جنس اور رنگ و نسل سے بلند ایسے قانون کا نفاذ ہے جو انسانوں کو معروضی طور پر عدل فراہم کر سکے۔ یہ وہ اہم ساتواں اصول ہے جو اسلامی شریعت کی آفاقیت اور عالمگیریت کا ایک ثبوت ہے۔ قرآن کریم عدل کے حوالہ سے یہ تعلیم دیتا ہے کہ چاہے ایک شخص مشرک ہو یا مسلم اس کے انسانی حقوق کا تحفظ اور اُسے عدل کی فراہمی اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ یہ عدل توحید کے مطالبات میں سے ایک مطالبہ ہے، چنانچہ اسلام کا نظام عدل، سماجی مرتبہ کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے معاشرہ کے نام نہاد اعلیٰ یا کم تر طبقات میں کوئی تفریق نہیں کرتا اور تمام انسانوں کو حضرت آدم کی اولاد تسلیم کرتے ہوئے مساویانہ عدل کا مستحق قرار دیتا ہے۔ دنیا کے دیگر نظام ہائے عدل بھی دعویٰ تو یہی کرتے ہیں لیکن آج تک وہ نسلی اور لسانی عصبیت سے آزاد نہیں ہو سکے۔

عالمی امن اور عدل اس وقت صحیح معنی میں قائم ہو سکتا ہے جب اس کی بنیاد وہ آفاقی اور عالمی

اصول ہوں جو کسی خطے، قوم یا نسل کی بنیاد پر وجود میں نہ آئے ہوں۔

ایک اور اہم جہت کا تعلق تہذیبی تنوع پر مبنی معاشرے کے قیام سے ہے جس میں مذہبی آزادی کو تسلیم اور اس کا احترام کیا جاتا ہو۔ اس کی صلح پسندی مسلم معاشرے کے اندر مختلف مسالک کی متوازی موجودگی کی گنجائش پیدا کرتی ہو۔ یہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے مذہبی اور انسانی حقوق کو بھی تسلیم کرتی ہو۔ حتیٰ کہ ایک کافر یعنی اللہ کی حاکمیت و اقتدار کا منکر بھی اپنے عقائد کے ساتھ جینے کا پورا حق رکھتا ہو[11]۔

عدل کے یہ سات پہلو، جو اس کے پورے مفہوم کا خلاصہ ہیں، صرف مسلمانوں یا کسی خاص وقت اور مقام کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ یہ آفاقی اخلاقی اصول ہیں جو امن، باہمی مفاہمت اور تعاون کی جانب رہنمائی کرنے والے عالمی مکالمے کے لیے ٹھوس بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

یہ اصول تہذیبی کثرتیت پر مبنی ایک عالمی اخلاقی نظام تعمیر کرنے کے لیے بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ ان اصولوں کا نفاذ زندگی میں وحدانیت، تضادات سے نجات، عقل و دلیل کی فوقیت، کشادہ نظری، جامد روایات سے آزادی اور انسانی جان، عزت اور مال کے احترام پر عامل معاشرہ وجود میں لاتے ہیں۔ مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست انہی اصولوں کی عملی تفسیر تھی۔ خلافت راشدہ کا روشن دور اس کی ایک تاریخی تعبیر تھی اور آج بھی پندرہ صدی گزرنے کے باوجود یہ آفاقی اخلاقی اصول ایسے ہی تابندہ ہیں جیسے پہلے تھے۔ آج بھی اس کی عملیت ویسی ہی ہے صرف انہیں سنجیدگی کے ساتھ نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔

اصولِ فقہ کے ائمہ میں سے بالخصوص الغزالی (م ۵۰۵ھ/ ۱۱۱۱) اور الشاطبی (م ۷۹۰ھ/ ۱۳۸۸) کے مطابق ان سات میں سے پانچ اصول مقاصد شریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن کے بیشتر احکام، ہدایات اور تعلیمات کی اساس، ان میں سے ایک یا زائد پر رکھی گئی ہے۔ یہ اصول اپنی آفاقیت کی بنا پر تبدیلی زمان اور مکان کے باوجود نہ صرف معیشت و معاشرت بلکہ سیاست و ثقافت کے لیے قابل عمل بنیاد فراہم کرتے ہیں اور نتیجتاً نہ صرف مسلم معاشرہ میں بلکہ ہر انسانی معاشرہ میں

پائیدار امن اور انصاف کے قیام کو ممکن بناتے ہیں۔

یہ سات اصول، اپنی آفاقی تطبیق اور تنگ نظری و فرقہ واریت سے بالاتر فطرت کی بناء پر، شفاف معاشرتی ایجنڈے کے ساتھ، عالمی امن کے مکالمے کے لیے بھی ایک بامعنی بنیاد پیش کرتے ہیں۔

اس مختصر جائزہ کی روشنی میں یہ آفاقی اصول اس طرف نشاندہی کرتے ہیں کہ عالمی امن کا قیام صرف اس وقت ممکن ہے جب معاشی، سیاسی اور ثقافتی عدل کو قائم کیا جائے اور شمالی اقوام عالمگیریت کے نام پر اپنی ثقافت، فکر اور معیشت و عسکری اثر کو قوت کے زور پر دوسروں پر مسلط نہ کریں۔

اسلام کے اخلاقی اصول اپنی آفاقیت کی بنا پر ایک پرامن معاشرہ کے قیام کے لیے جو نظام عمل پیش کرتے ہیں اُس سے قطع نظر سیکولر بنیاد پرستی، جو لادینیت پر ایمان رکھتی ہے اور اخلاق کو ایک اضافی قدر سمجھتی ہے، جو وقت اور مقام کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے ایک خالص مادہ پرستانہ معاشرہ کے وجود کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ سیکولر بنیاد پرستی امن، انصاف اور انسانیت ہر ایک کو انفرادی فیصلوں کا تابع بنا دیتی ہے اور ہر فرد اپنی صوابدید کے مطابق ان کی تعریف و تشریح کرتا ہے نتیجتاً فکری ٹکراؤ اور کشمکش انسانوں کی قسمت بن جاتی ہے۔ اس کے برخلاف اسلام کے عالمی اور آفاقی اخلاقی اصول اپنی رواداری، اور عدل کی بنا پر ایک ایسی انسانیت کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں جس میں تنوع ہو اختلافِ مذاہب ہو اور مختلف تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ کی جگہ بھلائی کے کاموں میں تعاون اور غیر اخلاقی امور میں عدم تعاون ہو اور ٹکراؤ اور کشمکش کی جگہ بقائے باہمی کے اصول پر عمل ہو۔

امن و عدل کا یہ نظام آج کے دور تشکیک میں کس طرح قائم ہو؟ کیا یہ محض ایک تصوراتی نظام ہے یا اسے آج کی دنیا میں عملاً نافذ کیا جا سکتا ہے؟ ہمارے خیال میں اسلامی نظام عدل و امن کی صداقت تاریخ کے آئینہ میں ایک ناقابل تردید واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نظام اپنی مکمل ترین شکل میں دور نبویؐ اور دور خلافت راشدہ میں قائم رہا اور بعد کے ادوار میں جزوی طور پر اس پر عمل ہوتا رہا ہے۔ آج کی دنیا میں بھی ان اصولوں کو جو آفاقی اخلاقی اصول ہیں، نہ صرف مسلم معاشروں میں بلکہ غیر